ڈاکٹر قاضی عابد

اردو میں لسانیات پر اوّلین رسالہ۔ ''علم اللّسان''

(تحقیقی وتنقیدی جائزہ)

اردو میں لسانیات کا آغاز روایتی قواعد کی کتب کی تالیف، لغت نویسی اور اردو زبان کے آغاز کے نظریات کی تشکیل سے ہوا۔ مستشرقین ہوں یا مقامی ماہرینِ لسانیات دونوں نے ہی اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار انہی تین میدانوں میں کیا۔ اس سلسلے کے بڑے ناموں میں گارساں دتاسی، فیلن، بنجمن شلزے، گراہم ٹی بیلی، پلیٹس، جان شیکسپیئر، انشاء اللہ خان انشاء اور محمد حسین آزاد کے علاوہ کچھ اور اہم لوگ شامل ہیں۔ تاہم گریرسن کا نام اور کام اس ضمن میں استثناء کا حامل ہے۔ میکس میولر جیسے اہم ماہر لسانیات کے آریائی نسلی تفاخر نے لسانیات سے اس کی فطری دلچسپی کو سنسکرت کے دائرے سے باہر نہیں آنے دیا۔ یوں ہمیں برصغیر کی زبانوں اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے مستشرقین میں گریرسن کے علاوہ کوئی اور بڑا ماہر لسانیات اردو زبان اور لسانیات کے ساتھ دلچسپی لیتا نظر نہیں آتا۔ ہمارے مقامی ماہرین لسانیات نے بھی اپنے پیش رو مستشرقین کی دلچسپیوں کے دائرے میں ہی اپنے سفر کو آگے بڑھایا۔ یوں ہم اردو لسانیات کی ابتدائی تاریخ پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں قواعد نویسوں اور اردو زبان کے آغاز کے نظریات پر لسانی مواد جمع کرنے والوں کی بہتات نظر آتی ہے۔ تا آنکہ بیسویں صدی کے طلوع پر ہی ہمیں ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ جیسے ماہرین لسانیات دکھائی دیتے ہیں جو قواعد نویسی، لغت نویسی اور اردو زبان کے آغاز کے نظریات سے صرفِ نظر کر کے لسانیات کے دوسرے میدانوں توضیحی لسانیات، تاریخی لسانیات اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اردو میں لسانیات کے علم کے تنوعات کو متعارف کرانے میں اپنی صلاحیتوں کا بہترین استعمال کرتے ہیں۔ اردو میں لسانیات کے علم کے

Scanned by CamScanner

تنوعات کو متعارف کرانے اور مغرب میں اس علم میں ہونے والی پیش رفت سے اردو دنیا کو شناسائی عطا کرنے میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر گیان چند جین، خلیل صدیقی، ڈاکٹر افتخار حسین اور ڈاکٹر عبدالسلام کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ جبکہ اس علم (لسانیات) کے دائرے میں اردو زبان کے حوالے سے تحقیق کرنے والوں میں حافظ محمود شیرانی، پنڈت دتاتریہ کیفی، ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر سہیل بخاری، عین الحق فرید کوٹی اور ڈاکٹر نصیر احمد خان کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ لیکن یہ امر اپنی جگہ پر دلچسپ ہے کہ اردو میں لسانیات کے علم کے حوالے سے پہلی بار ایک لغت نگار نے ہی مربوط اور منضبط انداز میں اپنی معلومات کا اظہار کیا۔

اردو کے اہم ترین لغت نگار مولوی سید احمد دہلوی (۱) نے ۱۸۹۵ء میں ''علم اللّسان'' (۲) کے نام سے ۴۰ صفحات (۱۹ سطور فی صفحہ) پر مشتمل ایک رسالہ دہلی سے شائع کیا جس میں لسانیات (۳) کے علم پر انہوں نے اپنی معلومات کو مربوط صورت میں اردو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہ رسالہ اس حوالے سے بے حد اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے کہ اردو میں اس سے پہلے علم لسانیات پر کوئی مصنف اس طرح سے بحث کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ سید احمد دہلوی کی بنیادی دلچسپی لغت نویسی ہے اور یہ ان کی لسانی دلچسپیوں کا ایسا محور و مرکز ہے کہ انہوں نے عمر عزیز کی پوری نصف صدی (۴) ''فرہنگ آصفیہ'' کی تالیف، ترتیب، تدوین، نظر ثانی اور اشاعت میں گزار دی لیکن اپنے مطالعے کے زور پر اور شاید فیلن کے ساتھ تعلقِ خاطر کی وجہ سے وہ علم لسانیات سے بھی اس سطح پر ضرور روشناس ہو گئے کہ انہوں نے اس علم (فلولوجی) کی مبادیات سے اردو زبان کے قاری کو روشناس کرنے کی اولین کوشش سرانجام دی۔

رسالے کا آغاز انسان اور کائنات کے آغاز کے حوالے سے ہوتا ہے۔ فاضل مؤلف پر ڈارون کے نظریۂ ارتقا کے واضح اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اس رسالے (علم اللّسان) کا ذیلی عنوان اس طرح سے قائم کرتے ہیں:

Scanned by CamScanner

"انسان کی ابتدائی - درمیانی اور اخیر زبان"(۵)

دراصل یہ وہ زمانہ ہے جب نظریۂ ارتقا کو "روحِ عصر" کا درجہ حاصل تھا اور مختلف علوم و فنون کے لوگ نظریۂ ارتقا کے تناظر میں اپنے اپنے علوم و فنون کی مختلف توجیہات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ سید احمد دہلوی نے بھی اس رسالے میں یہی تناظر اختیار کرتے ہوئے جب اپنے سامنے یہ سوال رکھا کہ انسان نے بولنا یا لکھنا (جو زبان کے دو بنیادی مظاہر ہیں) کب سیکھا تو انہیں لازمی طور پر اس سوال کا سامنا بھی کرنا پڑا کہ خود انسان، جس سے زبان کے یہ مظاہر مشروط ہیں، اس کرۂ ارض پر کب آباد ہوا۔ اس سوال کا قدیم جواب تو ہمیں مختلف تہذیبوں کی اساطیر اور مذاہب کے توسط سے ملتا ہے (٦) لیکن مغرب میں سائنس کے فروغ کے بعد اور مشرق میں مغربی سائنسی فکر کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے کی ادھوری کوششوں کے بعد کائنات کی قدامت کا پتہ چلانے کے لیے مختلف سائنسی علوم سے استفادہ کرنے کی روش بھی عام ہوئی۔ یہاں بھی علمِ طبقات الارض یا جیولوجی اور دیگر سائنسی علوم کے بارے میں فاضل مؤلف کو یہ علم ہے کہ یہ ایسے علوم ہیں کہ کائنات کے مختلف مظاہر کی کہنگی کے بارے میں بنیادی جانکاری دے سکتے ہیں۔ پھر یہ کہ انسان کیا اس کرۂ ارض پر انسان کے طور پر آیا یا پیدا ہوا یا پھر اس نے ارتقا کے مراحل طے کرنے کے بعد اپنے آپ کو اس موجودہ شکل میں ڈھالا۔ کونسے ایسے علوم ہیں جو اس بنیادی سوال کو حل کرنے میں ہماری معاونت کر سکتے ہیں۔ انسان اس کائنات میں موجود کن جانوروں سے مشابہت رکھتا ہے اور کیا منقولی علم ہمیں اس امر میں مطمئن کر سکتا ہے یا پھر ہمیں معقولی علم سے رجوع کرنا ہو گا اور یہ کہ منقولی اور معقولی علم میں کیا فرق ہے اور ان دونوں کی حدود و قیود کیا ہیں۔ اس رسالے کی ابتدا میں انہیں سوالات سے بحث کی گئی ہے:

> "اگر ہم اس بیان کو انسان کی ابتدائی حالت سے شروع کریں اور دکھائیں کہ اول میں انسان کیا تھا۔ اس کا ڈیل ڈول، اس کا چہرہ

Scanned by CamScanner

مہرہ، اس کی چمڑی، اس کا منہ یا تھوتھنی، اس کا سر کس رنگ ڈھنگ کا تھا اور پہلے ہم اسے ریچھ، بندر، بن مانس وغیرہ کن حیوانوں سے مشابہ پاتے تھے تو صرف یہ مضمون ہی طویل نہ ہو بلکہ انسانی ابتدائی حالت کی ایک مبسوط تاریخ بن جائے۔''(۷)

''ایسی باتوں کے دریافت کرنے اور پتہ لگانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک روایتی یا تاریخی جسے منقول کہتے ہیں، دوسری عقلی یعنی فطرتی جسے معقول یا فلسفہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ پہلی صورت کا سامان بہم پہنچانا یا اس پر اطمینان ہونا بہت دشوار ہے۔ البتہ دوسری صورت ایسی ہے کہ اسے ہر بشر کی عقل سلیم تسلیم کر سکتی ہے۔''(۸)

''علم طبقات الارض کے محققین کے قول کے بموجب انسان کو دنیا میں آئے ہوئے کم سے کم بیس ہزار اور زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ برس ہوئے۔''(۹)

اس رسالے میں اگلی بحث تو رسم الخط کے حوالے سے ہے لیکن اس کی ابتداء اس بات سے کی گئی ہے کہ آج کل (۱۸۹۵ء) تقریباً تین چار ہزار زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں (۱۰)۔ یہ تعداد ظاہر ہے کہ قیاسی ہے اور درست نہیں۔ اس وقت تک بولی جانے والی زبانوں کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہو گی کیونکہ زبان کی تاریخ کے علم سے دلچسپی رکھنے والوں کا خیال ہے کہ کم از کم اتنی زبانیں تو صرف برصغیر میں بولی جاتی ہیں۔ شاید دنیا میں بولے جانے والی تمام زبانوں کی تعداد کا صحیح اندازہ لگانا آج کے سائنسی دور میں بھی دشوار امر ہے۔ فنِ تحریر (رسم الخط) کی تاریخ کا تعین کرتے ہوئے فاضل مؤلف نے قیاس کیا ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار برس کی تاریخ کی حامل ہے۔ لیکن اس امر کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ اس فن شریف کے موجد کون تھے۔ ایرانی (جمشید)، یونانی، مصری یا پھر ہندوستانی (برہما گپتا)۔

Scanned by CamScanner

''فن تعلیم و تحریر کو نکلے ہوئے پانچ ہزار برس سے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ کوئی ایران کے بادشاہ جمشید کو اس کا موجد قرار دیتا ہے، کوئی یونانیوں کو، کوئی مصریوں کو، کوئی ہندوستان کے برہما گپتا کو۔''(۱۱)

لیکن جدید تحقیق اس ضمن میں واضح انداز میں ہمیں بتاتی ہے کہ فنِ تحریر کا آغاز قدیم عراقی تہذیب کی عطا ہے (۱۲)۔

فاضل مؤلف کا یہ نکتہ قابل غور ہے کہ رسم الخط ہی بنیادی طور پر زبان کو محفوظ کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے لیکن جدید لسانیات کی شریعت میں بولا ہوا لفظ لکھے ہوئے لفظ کی نسبت زیادہ باعثِ توقیر ہے۔ جدید لسانیات زبانوں کے مطالعے کے لیے تاریخی یا دور زمانی (Diachronic) منہاج کی جگہ یک زمانی (Synchronic) طریق کار کو اختیار کرتی ہے۔ اس لیے رسم الخط یا فن تحریر کی قدامت کی بحث اس کے دائرہ کار سے زیادہ علاقہ نہیں رکھتی لیکن سید احمد دہلوی کے زمانے میں یہ لسانیات کا ایک مرغوب اور پسندیدہ موضوع تھا۔

صوتیات جسے جدید لسانیات نے توضیحی لسانیات/عمومی لسانیات کے نام سے موسوم کیا ہے، لسانیات کی ابتدا ہی سے ایک اہم مبحث کے طور پر معروف ہے۔ سید احمد دہلوی نے ''علم اللّسان'' میں صوتیات (Phonetics) کے حوالے سے اپنے زمانے کے اردو لسانیات سے دلچسپی رکھنے والے مصنفین سے زیادہ معلومات اور بصیرت کا اظہار کیا ہے۔ لسانیات کی اس اہم شاخ کے حوالے سے انہوں نے اپنے رسالے میں جو سوالات اٹھائے ہیں یا کچھ سوالوں کا جواب فراہم کرنے کی کوشش کی ہے وہ یہ ہیں:

''قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ابتدا میں انسان بھی جو دیگر حیوانات میں شامل ہے، اس قسم کی بے معنی اور مہمل بولی بولتا تھا۔''(۱۳)

''ہم سوال کرتے ہیں کہ بعض تحقیق دوست بادشاہوں نے جیسے سب سے اول ایک یونان کے بادشاہ نے اور سب سے اخیر جلال

Scanned by CamScanner

الدین محمد اکبر بادشاہ ہندوستان نے جو انسان کے نوزائیدہ بچوں کو آبادی سے دور تہ خانوں کے اندر گونگے، بہرے آدمیوں تک محل میں پرورش کرایا اور ہر قسم کے اشاروں اور آواز سے خبردار نہ ہونے دیا ان کی بولی کیا ثابت ہوئی۔" (۱۴)

سید احمد دہلوی نے صوتیات کے حوالے سے بہت اہم باتیں کی ہیں جو ان کے زمانے میں تو اور زیادہ اہمیت کی حامل ہوں گی۔ کیونکہ یہ اردو صوتیات کا نقطہ آغاز ہے لیکن ہمیں ساری بحث فاضل مصنف کے زمانے کو مدِنظر رکھتے ہوئے کرنی ہوگی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لسانیات کے بارے میں اردو کے محققین اور ناقدین کا علم نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس لیے قیاس ہمیں اس طرف بھی لے جاتا ہے کہ سید احمد دہلوی نے شاید فیلن یا چند دیگر مستشرقین کے خیالات سے استفادہ کیا ہوگا۔ ان کا خیال ہے کہ ایک خاص جغرافیہ میں رہتے ہوئے لوگ ایک خاص عمر تک اپنی لسانی عادات وضع کر لیتے ہیں اور اپنی زبان کی خاص آوازوں کو نکالنا سیکھ لیتے ہیں۔ ان کے لیے اس لسانی عادت/عادات سے مطابقت نہ رکھنے والی زبان کے خاص الفاظ/حروف کی ادائیگی ناممکن ہو جاتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ فاضل مصنف کے ذہن میں یہ بات موجود ہے کہ صوتیات کا تعلق محض بولی جانے والی زبان سے ہے، لکھی جانے والی زبان سے نہیں۔ یوں ایک خاص زبان بولنے والا آدمی کسی دوسری زبان کو بولنے پر تو قدرت رکھ سکتا ہے لیکن وہ اس زبان کے الفاظ کو درست مخرج یا درست تلفظ کے ساتھ ادا نہیں کر سکے گا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ فاضل مصنف نے اس سوال کا جواب بھی دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مخصوص آب و ہوا اور جغرافیے کی وجہ سے زبان یا ہونٹ ایک خاص طرح کے جوگ کا شکار ہو جاتے ہیں اس لیے ایک خاص طرح کا لسانی رویہ اس خطے کے افراد میں پروان چڑھ جاتا ہے جس سے انحراف کرنا ان کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ اگرچہ جدید لسانیات ہمیں بتاتی ہے کہ لسانی رویے کو پورے اعضائے تکلم جنم دیتے ہیں لیکن سید احمد دہلوی نے اس حوالے

Scanned by CamScanner

سے صرف زبان اور ہونٹوں کا نام لیا ہے:

"بعض ملکوں کے آدمیوں کی ساخت وہاں کی آب و ہوا اور مقامات کے لحاظ سے ایسی واقع ہوئی ہے اوران کی زبانوں یا ہونٹوں میں کچھ ایسا بجوگ آ کر پڑا ہے کہ وہ بعض حرفوں کو ان کے اصلی مخارج سے نکالنے پر بالکل قادر نہیں۔" (۱۵)

انہوں (سید احمد دہلوی) نے مختلف خطوں کے لوگوں کی مثالیں دے کر اپنے مؤقف وضاحت کی ہے:

"کیا وجہ ہے کہ اہل عرب سے چ، پ، گ ادا نہیں ہوتا؟ کیا باعث ہے کہ ایران کے لوگ ٹ، ڈ، ڈھ، ڑ، ڑاں کا تلفظ ادا نہیں کر سکتے اور ہندی کر سکتے ہیں۔ اہلِ پنجاب ژ، ق کا تلفظ آسانی سے کیوں نہیں ادا کر سکتے اور ہندوستانی کر سکتے ہیں۔" (۱۶)

ان کے خیال میں اس کا سبب ان علاقوں کے باسیوں پر ان خطوں کے جغرافیائی پس منظر کا اثر ہے۔ جغرافیہ مختلف انداز میں اپنے باسیوں کی لسانی عادات پر اثر انداز ہوتا اور اس کی بنیادی خصوصیات متشکل کرتا ہے۔

"جس طرح آوازوں میں ساختِ آلاتِ تلفظ کے لحاظ سے فرق پڑا اسی طرح بلحاظِ آب و ہوا خواص ملکی میں بھی فرق پیدا ہوا۔ کہیں کوہستان اور میدانی مقامات کا اثر اپنا جلوہ دکھاتا ہے، کہیں کھادر، بانگر اور ریگستان کا پرتو اپنا سکہ بٹھاتا ہے۔" (۱۷)

"چٹیل میدانوں کے رہنے والوں کی آواز میں وہی ہمواری، سلاست اور روانی پائی جائے گی جو میدانوں کے لیے موزوں ہے اور جیسی بانگر کے لوگوں میں کرختگی ہے ویسی ہی ان کے الفاظ میں بھی خشونت ہے۔ جس طرح کھادر یا تری کے باشندوں میں تری

Scanned by CamScanner

ہے اسی طرح کی ان کی زبان میں بھی کمزوری اور ملائمت ہے۔
عرب جیسے خشک ملک کی زبان اونٹوں کی زبان سے کس قدر مشابہ
ہے۔ انگلستان جیسے سمندری جزیرے کی بولی دریائی جانوروں سے
کتنی مطابقت رکھتی ہے ..... ایران کی سریلی بولی اپنے ملک کی
معتدل آب و ہوا کس خوبصورتی سے ثابت کر رہی ہے۔'' (۱۸)

سید احمد دہلوی کی اس رائے کی کوئی علمی یا سائنسی بنیاد تو نظر نہیں آتی لیکن
ہوں نے مشاہدے اور قیاس کے تال میل سے جس طرح کی نظریہ سازی کی کوشش کی
ہے وہ ان کے زمانے کے لحاظ سے قابلِ ستائش ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جدید لسانیات
نے اس باب میں اب بہت سفر کر لیا ہے اور صوتیات کے حوالے سے ایک بڑا ذخیرۂ علم
وجود میں آیا ہے جو سید احمد دہلوی کی اس رائے سے زیادہ اتفاق نہیں کر سکتا۔ لسانی عادات
کی تشکیل ایک پیچیدہ عمل ہے اور اس کے محرکات ایک سے کہیں زیادہ ہیں۔ اس کے
باوجود ان کی یہ نظریہ سازی دلچسپی کے عنصر کی وجہ سے پُرکشش ضرور محسوس ہوتی ہے اور ان
کی رائے کو آسانی سے رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔

''صوتیات'' کے حوالے سے اس رسالے کی اگلی بحث آواز کے ایک اور اہم
پہلو سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ سوال صوتیات میں بہت اہمیت کا حامل ہے کہ آواز بنتی کیسے
ہے۔ جدید لسانیات ہمیں بتاتی ہے کہ سانس لینے کا عمل بنیادی طور پر بولنے کے عمل میں
معاون ہوتا ہے۔ اگر سانس لینے کا عمل رک جائے تو آواز بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس لیے
ہمیشہ بولنے کو زندگی کی بنیادی علامت سمجھا گیا ہے اور خاموشی کو موت کی۔ سید احمد دہلوی
نے اس بات کو دلچسپ پیرائے میں بیان کرنے کی سعی کی ہے:

''سانس بذاتِ خود اپنے مخارج یعنی ناک، گلے یا منہ میں آنے
جانے سے ایک آواز پیدا کرتا ہے اور یہ بات بتاتا ہے کہ اگر مجھ کو
ذرا زور سے بولو گے تو کچھ بڑی آواز اور جو سینے پر زیادہ دباؤ ڈال

Scanned by CamScanner

کر کھینچو گے تو اس سے بھی بڑی صدا پیدا کر دوں گا۔ اس سے
ثابت ہوا کہ انسان یا حیوان کے بولنے کا پہلا سبب یا اس کے نطق
کا پہلا استاد سانس ہے۔''(۱۹)

جدید لسانیات اگرچہ آج اعضائے تکلم کا بہت گہرا مطالعہ کرتی ہے اور تلفظ کی صوتیات ہمیں بتاتی ہے کہ سانس جب مختلف اعضائے تکلم کے ساتھ تعامل کرتی ہے تو مختلف طرح کی آوازیں (اصوات) پیدا ہوتی ہیں۔ فاضل مصنف کے زمانے میں جب ابھی اردو میں لسانیات کے ماہرین صوتیات سے شناسا ہی نہیں تھے، اس طرح کی آراء کا اظہار بھی ایک بہت بڑا قدم ہے جو قابلِ استحسان ہے۔ انہوں نے صوتیاتی درجوں کی بھی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ ابتدائی صوتیاتی درجے میں اَ، اِ، اُ کی آوازیں بنتی ہیں (یاد رہے کہ وہ اردو زبان کے حوالے سے بحث کر رہے ہیں)۔ اس کے اسماء اور افعال اور پھر روابط کے حروف/الفاظ وجود میں آتے ہیں۔ جدید صوتیات بھی ہمیں اس انداز کی آگہی عطا کرتی ہے۔ جدید صوتیات آواز/اصوات کے درجوں کے تعین کے بعد ہمیں بتاتی ہے کہ اَ، اِ، اُ کی اصوات نکالتے ہوئے سانس روکتے کیسے ہیں اور نکالتے کیسے ہیں۔ سید احمد دہلوی نے بھی اسی طرح سے اصوات سازی کا تعین کیا ہے لیکن وہ جدید صوتیات کی طرح سے اپنی آراء سے سماجی لسانیات کا تناظر علیحدہ نہیں کر سکے اور یہ کوئی اتنا زیادہ قابلِ اعتراض امر بھی نہیں ہے۔ وہ لسانیات کے ایک ایسے طالب علم کے طور پر سامنے آتے ہیں جس کے زمانے میں لسانیات کے مختلف شعبوں نے ابھی مغرب میں بھی اپنی حدود کا اتنا کڑا تعین نہیں کیا تھا جس قدر آج کے زمانے میں لسانیات کرتی نظر آتی ہے۔

''دنیا کے ابتدائی دھندے سب ان تین آوازوں یعنی اَ، اِ، اُ میں
موجود تھے اور ہر ایک کیفیت انہیں کے گھٹانے بڑھانے سے حاصل
ہو جاتی تھی۔ چنانچہ جب لوگوں میں اول اول تمدنی مادہ پیدا ہوا۔

Scanned by CamScanner

گھر بار بسا کر رہنے، مل جل کر ایک جگہ بیٹھنے اٹھنے لگے تو انہوں نے اپنے اپنے مخاطبوں حاضر اور سامنے کے لوگوں سے خطاب کرنے کے لیے اَ، اشارۂ قرب کے واسطے اِ، کنایۂ بعید کے لیے اُ۔ بشرکت اعضائے جسمانی یعنی (سر، انگشت، پا، چشم وغیرہ) سے کام لینا شروع کیا۔ اظہارِ درد، اظہارِ خوشی، نداندیہ میں یہی خطابی اَ، کام دیتا رہا۔'' (۲۰)

فاضل مصنف نے قیاسی طریق کار سے کام لے کر زبان کے متشکل ہونے کی داستان بھی بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ مباحث بھی بنیادی طور پر سماجی لسانیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کسی بھی زبان کا ذخیرۂ الفاظ انسانی ضروریات کی بنیاد پر وجود میں آتا ہے۔ انسان اپنی ضروریات کے مطابق اپنی زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں مسلسل اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ زبان بنیادی طور پر ایک سماجی عمل ہے اور سماجی احتیاجات کو پورا کرتی ہے اور یوں اس خاص زبان کی لغت بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ زبان کا تعلق اس خطے کی ثقافت سے بھی ہوتا ہے جس مخصوص خطے میں وہ بولی جا رہی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف خطوں میں یہ مختلف انداز سے میں متشکل ہوتی ہے اور مختلف انداز میں ترقی کرتی ہے۔

''اگر کسی خطہ کے آدمیوں پر مصیبت زیادہ پڑی ہے تو وہاں مصیبت کے متعلق زیادہ الفاظ بنے اور جو کہیں راحت و اطمینان حاصل رہا ہے تو وہاں عیش و آرام کے لغت زیادہ وضع ہوئے'' (۲۱)

''اگر کہیں جنگ کا زیادہ اتفاق پڑا ہے تو وہاں جنگ سے تعلق رکھنے والے لفظ بکثرت موجود ہو گئے۔'' (۲۲)

''جب روز بروز احتیاجیں بڑھنی شروع ہوئیں اور ان کے کاموں کی ضرورتوں نے اور بھی طول پکڑا تو جہاں جہاں تک آدمی کی آواز پہنچ

Scanned by CamScanner

سکتی تھی اتنے فاصلے کے واسطے چند مفرد اور سہل الخروج حروف
اپنے اپنے ملک کے موافق تجویز ہوئے۔" (۲۳)

اس رسالے میں لسانیات کے حوالے سے اگلی بحث لفظ اور معنی کے رشتے کے حوالے سے ہے۔ آج لسانیات کی جو شاخ اس سے بحث کرتی ہے وہ لسانیات کے یک زمانی (Synchronic) اندازِ مطالعہ کو ہی درست قرار دیتی ہے اور خیال کرتی ہے کہ لفظ اور معنی کا تعلق منطقی نہیں ہوتا بلکہ اس پر اس معاشرت کے باسی متفق ہو جاتے ہیں اور اس ضمن میں اہم بات یہ ہے کہ لفظ اور اس کی صوت کا اس کے معنی کے تعین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کوئی بھی معاشرہ بغیر کسی علت و معلول کے تعلق کے یا کسی الہامی یا اَن دیکھی وجہ کے ایک لفظ کے خاص معنی پر متفق ہو جاتا ہے۔ مثلاً پانی کو اردو بولنے والے پانی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اس پر بغیر کسی علت و معلول کے رشتے کے متفق ہو گئے اس لیے نہیں کہ پانی کی صوت اس کے معانی کا تعین کرتی ہے۔ سید احمد دہلوی کی بصیرت انہیں جدید لسانیات سے جوڑتی بھی ہے اور ان کی سوچ میں اس سے ایک بُعد بھی دکھائی دیتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ کسی بھی زبان میں بامعنی اصوات کے بننے میں انسانوں کا شعور کام کر رہا ہوتا ہے۔ اگر ہم غور کریں تو یہ وہی شے ہے جسے جدید لسانیات کا پیش رو فرڈی ناںڈ سا شیور لفظ اور معنی کے درمیان ایک ایسا تعلق قرار دیتا ہے جس پر معاشرہ متفق ہو جاتا ہے۔ فاضل مصنف کا یہ بھی خیال ہے کہ لفظ، اس کی صوت اور اس کے معنی کے درمیان ایک تعلق ضرور ہوتا ہے اور قدیم ماہرین لسانیات اس بات کی تکرار کرتے رہے ہیں۔

"اب بامعنی اصوات یا الفاظ بننے کی نوبت آئی۔ یہ سب جانتے ہیں کہ انسان کو خدا تعالیٰ نے مختلف بیش بہا قوتوں کے علاوہ قوائے عقلی بالتخصیص عطا فرمائے ہیں یعنی اول قوت مدرکہ جس سے ہر چیز کا ادراک ہوتا ہے، دوم قوتِ حافظہ جس سے ہر ایک بات دماغ میں

Scanned by CamScanner

محفوظ یا یاد رہتی ہے۔ سوم قوتِ متخیلہ یعنی خیالی قوت جو دماغ میں ایک صورت پیدا کر دیتی ہے چہارم عقل یعنی قوتِ تمیز پس بامعنی صوت یا لغت انہی چاروں مرحلوں کو طے کر کے بنا۔'' (۲۴)

''اسمائے اصوات یعنی جن سے جاندار یا بے جان چیزوں کی آواز بیان کرتے ہیں ہمارے رہبر بنے کبھی ہم نے ہوا کو چلتے ہوئے دیکھ کر اس کے چلنے کی نقل سائیں سائیں کے لفظ سے ادا کی۔ کبھی پانی کو برستے دیکھ کر اس کی سریلی آواز کو چھم چھم سے تعبیر کیا۔'' (۲۵)

''بعض نام ان کے افعال کے سبب رکھے گئے۔ جیسے مارخور ایک بکرا ہے جو سانپ کو کھا جاتا ہے۔ چوہے مار ایک شکاری پرند کا نام ہے جو چوہے کا شکار کیا کرتا ہے۔ نیولا ایک قسم کا چوہا ہے جو نیو کھود ڈالتا ہے اسی طرح اور بہتیرے نام ہیں جو کسی خاص صفت سے تجویز ہوئے ہیں۔'' (۲۶)

یوں فاضل مصنف نے قیاس سے کام لیتے ہوئے زبان کی تاریخ بھی مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ بعض اشیا/ جانوروں کے نام ان کی آواز/ افعال اور اشکال کی مشابہت کی وجہ سے طے ہوئے لیکن زبان کی تاریخ کا ایک اہم موڑ یا سنگ میل وہ تھا جب انسان نے اسماء کو نسبت دینا اور افعال اور مصادر کو جوڑنا سیکھا اور پھر گنتی کا عمل بھی انسانی زبان کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔

''جب اسماء یعنی نام بھی تجویز ہو گئے تو اب ایک اور دقت پیش آئی وہ یہ ہے کہ جس وقت آپس میں باتیں کرتے وقت مختلف اسموں کا مجموعہ تو اکٹھا ہو جاتا مگر ان میں باہم نسبت دینے، ربط اور لگاؤ پیدا کرنے والا کوئی وسیلہ نہ ہوتا۔ اس دقت کے رفع کرنے کے واسطے باہم لگاؤ پیدا کرنے والے حروف یا حرکتیں تجویز ہوئیں لیکن

Scanned by CamScanner

فعلوں، مصدروں کے بغیر بھی ایک ناتمام لگاؤ رہا۔ پس اب افعال اور مصادر تجویز ہوئے اور ساتھ ہی بعض چیزوں کے شمار کا موقع بھی آنے لگا جس کے سبب انگلیوں سے گِننے کا کام لینا شروع کیا۔''(۲۷)

یہاں فاضل مصنف دراصل یہ بتانا چاہتے ہیں کہ زبان کی تاریخ میں قواعد کی دریافت اہم ترین موڑ کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ قواعد کے ذریعے زبان ایک اجتماعی روپ اختیار کرتی ہے۔

زبان کی سماجی حیثیت سے بحث کرنا فاضل مصنف کو بے حد مرغوب ہے۔ اس لیے وہ جہاں بھی موقع ملے زبان کی اس حیثیت پر اظہارِ خیال ضرور کرتے ہیں۔ یوں اس رسالے میں انہوں نے صوتیات اور سماجی لسانیات سے ہی زیادہ شغف ظاہر کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ لفظ اپنے زمانے کی سماجی تاریخ ہوتا ہے۔ اس کلیہ سازی کے بعد وہ ہندوستانی زبانوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان زبانوں میں تہذیب و شائستگی کی یوں کمی ہے کہ ان زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ میں فحش الفاظ موجود ہیں۔

''اگر ذرا توجہ سے دیکھا جائے تو بخوبی ثابت ہو جائے گا کہ جن الفاظ کو ہم مردہ یا ایک قالب بے جان تصور کر رہے ہیں یہ سب بڑے بڑے واقعات کا مرقع یعنی ایک زندہ تاریخ اور ہمارے بزرگوں یعنی کل انسانوں کے خیالات عمری واقعات دنیوی و دینی تاریخ ہر زمانے کے اخلاق و رواج اور جملہ سرگزشتوں کا ایک بے حد ذخیرہ ہیں۔''(۲۸)

''ہندوستانی زبان پر سب سے زیادہ اور بھاری اعتراض یہی ہے کہ اس میں قابلِ شرم الفاظ اور محاورے زیادہ پائے جاتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہم لوگوں کے خیالات قابلِ اصلاح اور

Scanned by CamScanner

ہماری تہذیب ابھی بہت کچھ درستی طلب ہے۔ ہم نے ان الفاظ کو اپنا تکیہ کلام بنا رکھا ہے جنہیں مہذب ملک کے باشندے زبان پر لانا بھی ایک قومی جرم اور مہذب سوسائٹی کا کبیرہ گناہ تصور کرتے ہیں۔''(۲۹)

فاضل مصنف کی اس رائے پر دو اعتراضات بجا طور پر کیے جا سکتے ہیں جن میں سے ایک کا تعلق لسانیات اور دوسرے کا تعلق پس نو آبادیاتی طریق احساس سے ہے۔ جدید لسانیات اب کسی بھی زبان کی لغت کو اس طرح نہیں دیکھتی کہ اس زبان میں کتنے الفاظ و محاورات فحش ہیں اور کتنے پاکیزہ۔ دراصل فاضل مصنف اپنے زمانے کے اصلاحی نقطۂ نظر کے اسیر ہیں اور یوں لگتا ہے کہ ان پر بھی حالی کی طرح سرسید کی تحریک کے فکری اثرات بہت گہرے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہمیں اپنی زبان اور ثقافت کے بارے میں نوآبادیاتی قوتوں نے طرح طرح کے احساسِ کمتری میں یوں مبتلا کیا کہ انہوں نے مشرق کی ایک بھیانک اور مکروہ تصویر بنا کر ہمارے سامنے رکھ دی اور کہا کہ یہ مشرق ہے اور قابلِ اصلاح ہے۔ ہم میں سے بھی اکثر لوگوں نے اس تصویر کو قبول کر لیا لیکن جدید زمانے کے پس نوآبادیاتی مفکرین جیسے ایڈورڈ سعید، فرانز فینن اور ہومی کے بھابھا وغیرہ اس تصور کو تسلیم نہیں کرتے اور ان تصورات کی رد تشکیل پر زور دیتے ہیں۔ کیا خود مغربی ممالک کی زبانوں میں اس طرح کے الفاظ موجود نہیں ہیں۔

اس اہم رسالے کے ایک حصہ میں فاضل مصنف نے اشتقاقیات سے بھی اپنی دلچسپی کو ظاہر کیا ہے اور مختلف شہروں کے نام رکھنے کی وجوہات بیان کی ہیں۔ اسی طرح سے انہوں نے مختلف محاوروں کو بھی ان کے درست تناظر میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

''توران: جو ایک پرانا ملک ہے اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ فریدون نے اپنے بڑے بیٹے تور کو یہ ملک دیا تھا جس کی وجہ سے یہ نام پڑ گیا۔''(۳۰)

Scanned by CamScanner

''چام کے دام۔ اس مثل سے نظام سقہ کی ڈھائی دن کی بادشاہی،
شیر شاہ اور ہمایوں کی بھاری لڑائی کا سماں بندھتا ہے۔''(۳۱)

سید احمد دہلوی نے اس اہم رسالے کے آخر میں انسان کی زندگی کی طرح زبان کی زندگی کو بھی چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

''جس طرح انسان کی عمر کے چار زمانے ہوتے ہیں اسی طرح
زبان کے بھی چار ہی درجے ہیں۔''(۳۲)

ان کے خیال میں یہ چار زمانے طفلی، جوانی ادھیڑ پن اور بڑھاپا ہیں لیکن جدید لسانیات اب زبانوں کے زمانی تسلسل کو اس طرح نہیں ناپتی۔ یہ اس رسالے کی آخری بحث ہے۔ اردو لسانیات کی تاریخ میں یہ رسالہ محض اس لیے اہمیت کا حامل نہیں ہے کہ یہ اردو میں لسانیات کے مباحث پر اولین رسالہ ہے بلکہ سید احمد دہلوی نے جس طرح سے انیسویں صدی کے اواخر میں لسانیات کا شعور عام کرنے اور لسانیات کے مختلف مباحث کو بیان کرنے کی سعی کی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ انہوں نے لسانیات کے بعض ایسے گوشوں پر بھی خامہ فرسائی کی ہے جس پر آج بھی اردو میں بہت کم مواد میسر ہے۔ وہ اردو کے پہلے لسانیات شناس ہی نہیں بلکہ آج بھی اس علم کے ایک اہم فرد کے طور پر شناخت کیے جانے کے قابل ہیں۔ انہوں نے اپنے مختصر رسالے میں لسانیات کی کئی جہتوں کو اردو میں روشناس کرایا ہے۔ ان کا یہ کام ان کی معروف لغت ''فرہنگ آصفیہ'' کے سائے میں آ جانے کی وجہ سے زیادہ روشن نہیں ہو سکا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے زمانے میں ان کے علاوہ لسانیات کے علم کا اس قدر شعور رکھنے والا مقامی دانشور بالکل ہی نظر نہیں آتا۔ وہ اردو لسانیات کی تاریخ میں محض اولیت کی بنیاد پر ہی نہیں بلکہ اپنے کام کی اہمیت کی وجہ سے یاد رکھے جانے کے لائق ہیں۔

•••○•○•••

Scanned by CamScanner

حوالہ جات/ حواشی

مولوی سید احمد دہلوی ۸ر جنوری ۱۸۴۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید عبدالرحمن مونگیری تھا۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت عبدالقادر جیلانیؒ سے جا ملتا ہے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم مختلف مدارس سے حاصل کی جن میں دہلی نارمل سکول بھی شامل ہے۔ انہوں نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز عورتوں اور بچوں کی تعلیم و تربیت پر رسائل لکھنے سے کیا۔ وہ سات برس تک (۱۸۷۳ء تا ۱۸۷۹ء) ڈاکٹر ڈبلیو ایس فیلن کی ملازمت میں رہے اور ان کی معروف انگریزی اردو لغت کی تالیف و تدوین میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ اس کے بعد الور کے مہاراجہ کی ملازمت اختیار کی اور اس کا سفر نامہ تحریر کیا۔ وہ کچھ عرصہ انجمن پنجاب سے بھی متعلق رہے اور پنجاب بک ڈپو لاہور میں نائب مترجم کے طور پر کام کیا۔ نیز دہلی اور لاہور کے سکولوں میں تدریس بھی کی۔ ۱۸۶۸ء سے ہی فرہنگ آصفیہ پر کام شروع کر دیا۔ اس کا ایک حصہ ''تدوین مصطلحات اردو'' کے نام سے ۱۸۷۱ء میں اور کچھ حصہ ''ارمغانِ دہلی'' کے نام سے ۱۸۷۸ء میں شائع ہوا۔ پھر انہوں نے ہندوستانی اردو لغت کے نام سے نومبر ۱۸۸۲ء سے بالاقساط اسے شائع کرنا شروع کر دیا۔ ابتداء میں ۲۴ صفحات ماہ بماہ اور جولائی ۱۸۸۳ء سے ۳۲ صفحات ہر مہینے شائع ہوتے رہے۔ ۱۸۸۸ء میں ان اجزاء کو مربوط کر کے ''فرہنگ آصفیہ'' کی پہلی اور دوسری جلد کی شیرازہ بندی کی۔ حکومتِ حیدرآباد کی طرف سے مالی سرپرستی اور ماہانہ وظیفہ میسر آ گیا۔ ۱۸۹۸ء میں جلد دوم اور ۱۹۰۱ء میں جلد چہارم شائع کی۔ ۱۹۰۸ء میں مکمل فرہنگ ایک ہی شکل وصورت اور تقطیع میں شائع ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں گھر کو آگ لگ گئی اور لغات کی جس قدر جلدیں گھر میں موجود تھیں جل کر راکھ ہو گئیں۔ سو ایک بار پھر حیدرآباد کی ریاست نے مالی مدد کی اور ''فرہنگ آصفیہ'' مولوی صاحب کی زندگی میں آخری بار ۱۹۱۲ء میں شائع ہونی شروع ہوئی اور ۱۹۱۸ء میں اس کی اشاعت کا کام مکمل ہوا۔ جونہی اس کی اشاعت کا کام مکمل ہوا مولوی صاحب نے بھی رختِ سفر باندھا۔ ۱۱ر مئی

Scanned by CamScanner

۱۹۱۸ء کو سید احمد دہلوی فوت ہو گئے۔(ان معلومات کے لیے فرہنگ آصفیہ کے دیباچہ اور تقاریظ سے استفادہ کیا گیا ہے)

۲۔ یہ رسالہ ۱۸۹۵ء میں پہلی بار دہلی سے شائع ہوا۔ دوسری بار یہ دارالاشاعت لاہور سے ۱۹۰۰ء میں شائع کیا گیا۔ ۱۹۰۸ء کی ''فرہنگ آصفیہ'' کی اشاعت میں اسے دیباچے میں شامل کر لیا گیا۔

۳۔ مولوی سید احمد دہلوی ''علم اللسان'' سے ''Linguistics'' کی بجائے ''فلولوجی'' مراد لیتے ہیں۔ دیکھیے ۱۹۱۸ء کی اشاعت کا سرورق مشمولہ مولوی سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، لاہور، اردو سائنس بورڈ، بار دوم، ۱۹۸۷ء

۴۔ فرہنگ آصفیہ کی تالیف کا عمل ۱۸۶۸ء میں عرب سرائے دہلی سے شروع ہوا۔ اگرچہ اول اول اس کو یہ نام نہیں دیا گیا لیکن جو اجزاء مختلف ناموں سے مرتب ہوتے رہے وہ بالآخر ۱۹۱۸ء میں مکمل شدہ صورت میں ضم ہو گئے۔ یوں اردو لغت نویسی کا یہ بڑا کارنامہ فردِ واحد نے پورے پچاس برس میں سرانجام دیا۔

۵۔ دیکھیے سرورق رسالہ، علم اللسان، دفتر فرہنگ آصفیہ، دہلی، ۱۸۹۵ء

۶۔ اساطیر کے بارے میں ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ یہ اپنے زمانے میں مختلف مظاہر کی سائنسی توجیہہ پیش کرتی ہیں۔ ہمارے زمانے کے ایک فاضل سکالر ابنِ حنیف نے اپنی کتاب ''تخلیق کائنات'' میں عراقی اور یونانی اساطیر کے حوالے سے ان خطوں کے قدیم باشندوں کے نظریۂ تخلیق کا علمی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ پھر مختلف آسمانی (سامی) مذاہب کے ماننے والے ان مذاہب کے صحائف میں موجود کہانیوں کو اساطیر کہنے میں تو ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں لیکن یہ کہانیاں بھی تکوین کائنات اور ہبوطِ آدم کے دلچسپ قصص جس انداز سے بیان کرتی ہیں ان سے اس کائنات کی قدامت کے حوالے سے ان مذاہب کے ماننے والوں کے تصورات کے ساتھ ساتھ کچھ دلچسپ مباحث بھی سامنے آتے ہیں۔

۷۔ سید احمد دہلوی، علم اللسان، دہلی، دفتر فرہنگ آصفیہ، ۱۸۹۵ء، ص ۲

Scanned by CamScanner

۸۔ سید احمد دہلوی، علم اللسان، دہلی، دفتر فرہنگ آصفیہ، ۱۹۲۵ء، ص ۳

۹۔ ایضاً، ص ۳

۱۰۔ ایضاً، ص ۴

۱۱۔ ایضاً، ص ۴

۱۲۔ ابن حنیف، دنیا کا قدیم ترین ادب، ملتان، بیکن بکس، ص ۸۲، جلد اول

۱۳۔ علم اللسان، ص ۸

۱۴۔ ایضاً، ص ۹

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۰

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۰

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۰، ۱۱

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۱

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۳، ۱۴

۲۱۔ یوں لگتا ہے کہ اس نظریے کو وضع کرتے وقت فاضل مصنف کے ذہن و شعور میں دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کی تفریق موجود تھی۔ دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کی شعری لغت میں اوپر بیان کیا گیا فرق بہت ہی واضح انداز میں نظر آتا ہے۔

۲۲۔ علم اللسان، ص ۱۵

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۴، ۱۵

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۶

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۷، ۱۸

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۹

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۱

Scanned by CamScanner

۲۸۔ علم اللسان، ص ۲۴

۲۹۔ ایضاً، ص ۲۴

۳۰۔ ایضاً، ص ۲۶

۳۱۔ ایضاً، ص ۲۹

۳۲۔ ایضاً، ص ۳۸

Scanned by CamScanner

علم اللسان

یعنی

انسان کی ابتدائی۔ درمیانی اور اخیر زبان

مصنفہ

مولوی سید احمد صاحب دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ

حسب فرمائش عزیز احمد صاحب منشی فاضل

سید دربار احمد صاحب نے مطبع محبوب المطابع میں چھپوا کر

دفتر فرہنگ آصفیہ گلی شاہ تارہ اجمیری دروازہ دہلی

سے شائع کیا

قیمت ۱۲/

Scanned by CamScanner

اس کا بولنا نہ چھوڑتے۔ مگر کچھ سے کچھ ضرور کر لیتے چنانچہ اب بھی کتابی اور بول چال زبان میں بہت بڑا فرق ہو گیا ہے۔

آج کل انگریزی۔ جرمنی۔ فرانسیسی۔ ترکی۔ ایرانی۔ چینی۔ جاپانی۔ روسی وغیرہ زبانوں کا شاہی زبان ہونے کے باعث عروج پر ہے کیونکہ ان زبانوں کے سرپرست موجود اور ان سے ان میں علمی خزانے بھر رہے ہیں۔ ہماری اردو زبان ابھی تک ابتدائی حالت میں ہے گو سرکار انگلشیہ کی توجہ سے کچھ ترقی کر گئی ہے لیکن یہ ترقی چند روزہ ہے اس لئے کہ عدالت کی زبان اب انگریزی ہوتی جاتی ہے تمام دفاتر اس میں ہو گئے اور ہو رہے ہیں۔ غرض علمی اور شاہی زبان ہمارے ہندوستان کے واسطے یہی قرار پانے والی ہے ہندوستانی زبان صرف دیسی زبان ہونے کے لحاظ سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے ہے گویا یہ زبان اب اپنے صرف ہندوستانیوں کی حمایت پر ترقی کر سکتی ہے ورنہ اس کا بھی عنقریب زوال شروع ہو جائے گا۔ اور وہی مثل صادق آئے گی ؎ ہمیں تو موت ہی آئے شباب کے بدلے

سید احمد دہلوی

۱۹ جون ۱۸۹۵ء مقام شملہ

Scanned by CamScanner